15

امرا، توجہ کریں

فرمودہ ۲۳ راگست ۱۹۱۸ء

حضور نے تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد مندرجہ ذیل آیت پڑھ کر فرمایا:-
"وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ - (انفال رکوع ۳)

ہر ایک کام کیلئے نہایت ضروری ہوتا ہے کہ انسان اس کے متعلق جسقدر امور ہیں ان سبکو مدِنظر رکھے۔ مثلاً کسی کام کے کرنے سے پہلے ضرورت ہے کہ سوچا جائے کہ اس کی غرض کیا ہے ؟ اور اس کے کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ کیا ضرورت ہے اور کون سے ذرائع ہیں جن سے وہ کام کامیابی کے ساتھ ہوسکتا ہے اور کیا روکیں ہیں جو اس کے رستہ میں حائل ہیں۔ اگر ان باتوں پر غور نہ کیا جائے تو پھر کامیابی نہیں ہوسکتی مثلاً کوئی شخص کسی کام کو شروع کرتا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ اس میں فوائد کیا ہیں۔ تو وہ ہرگز باوجود اس کام کے کرنے کے اس میں اسقدر محنت نہیں کریگا جسقدر محنت کرنے کی ضرورت ہوگی اور نہ وہ اسقدر محنت کرنے کے لیے تیار ہوسکتا ہے اس کی کوشش اُدھوری رہے گی۔ اس کا جوش سرد ہوگا، لیکن اگر اس نے غور کیا ہوگا اور اسے معلوم ہوگا کہ یہ کام کتنا مفید ہے اور اس پر یہ ثابت ہوگیا ہوگا کہ اس کے کرنے سے مجھے کتنے فوائد حاصل ہونگے تو پھر اس کی توجہ ہمہ تن اس کی طرف لگ جائیگی۔

مثلاً جنگ ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی قوموں نے بھی کی اور آپ کے وقت بھی ہوئی کئی فاتح اُٹھے ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو قریبا ساری دُنیا پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک تو تیمور ہے اور ایک حد تک نپولین جس کی فتوحات یورپ اور افریقہ میں تھیں۔ ان سے پہلے سکندر اور سکندر سے پہلے ایرانیوں نے بھی کئی فتوحات حاصل کیں۔ مگر آج جو حالت ہے وہ پہلے نہیں تھی۔ جیسی کوشش سے آج جنگ ہو رہی ہے۔ ویسی کبھی پہلے نہیں ہوئی۔ پہلی جنگیں بادشاہوں کی جنگیں تھیں۔ اور تھوڑی ایسی جنگیں تھیں۔ جنکو رعایا نے اپنی جنگ خیال کیا۔ سوائے ان جنگوں کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

سے ہوئیں۔ پہلی جنگیں ایسی تھیں کہ سپاہی کچھ تنخواہ لیتے تھے۔ ان کو فریقِ مخالف کے خلاف کوئی جوش نہ ہوتا تھا۔ انہیں یہ مدِّنظر نہ ہوتا تھا کہ تیمور فتح حاصل کرتا ہے یا اس کا مدِمقابل، وہ لڑتے تھے لیکن اصل جوش ندارد تھا۔ ہاں وہ جوش پیدا ہوجاتا تھا۔ جو لڑائی کے وقت ہوتا ہے۔ جو دوست لڑائی سے آتے ہیں۔ ان میں سے بعض سے مَیں نے پوچھا ہے کہ لڑتے وقت کیسا جوش ہوتا ہے۔ جوش پیدا ہونے کے تو سب مقر ہیں، مگر ایک نے کہا کہ لڑتے وقت خودبخود اس نظارہ سے ایک جوش پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر اس وقت ہتھیار نہ ہوں تو ہاتھوں سے ہی دشمن کو نوچ لینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ جوش تو ہے، مگر یہ جنگ کے باعث ہے نہ کہ جنگ اس جوش کے باعث ہوتی ہے تو وہ جوش اصلی جوش نہیں تھے۔ کیونکہ وہ جنگیں ملک کی جنگیں نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ راجاؤں اور بادشاہوں کی جنگیں ہوتی تھیں۔ اس لیے اس جنگ کا اثر بھی ہوتا تھا کہ لڑنے والے ایک میدان میں لڑتے تھے۔ اگر اس میں قدم اُکھڑ گئے تو شکست ہوگئی اور اس ملک کے باشندے وفود کی صورت میں فاتح کی خدمت میں حاضر ہوگئے کہ ہم آپ کے تابع ہیں۔ کیونکہ لڑنے والوں کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کہ ہم کیوں لڑے تھے اور کیوں لڑائی کو جاری رکھیں، لیکن آج تعلیم کی ترقی کی وجہ سے ہر شخص کو حکومت میں کچھ نہ کچھ دخل ہے اس لیے وہ جنگ راجہ یا بادشاہ کی جنگ نہیں خیال کرتا۔ بلکہ یہی خیال کرتا ہے کہ میری جنگ ہے اور اس میں اگر شکست ہوئی تو میری آزادی چھن جائیگی۔ ایشیائی افواج کو اگر الگ کرکے دیکھا جائیگا۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یورپین اقوام اسی غرض سے لڑ رہی ہیں کہ اس جنگ میں ہماری بادشاہت ہماری حکومت اور ہماری آزادی خطرہ میں ہے۔ بڑے بڑے امراء جن کی ہزاروں لاکھوں کی آمدنی ہے وہ معمولی سپاہیوں کی طرح میدان میں لڑ رہے ہیں۔ گھر بار آرام و آسائش اور بیسیوں خدمتگذاروں کو چھوڑ کر ایک سپاہی کی حیثیت سے میدان میں دوسروں کی خدمت کر رہے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ جانتے ہیں کہ اگر ہم نے سُستی سے کام لیا تو ہماری قومی آزادی مٹ جائیگی۔ جرمن و آسٹریا میں بعض علاقے ہیں جو اس جنگ کو اپنی جنگ نہیں سمجھتے۔ بلکہ بادشاہوں کی جنگ جانتے ہیں۔ اس لیے ان میں لڑائی کے لیے کوئی خاص جوش نہیں۔ ہے اور جب وہ خطرہ دیکھتے ہیں تو بھاگ جاتے ہیں۔ لیکن جو قومیں اس جنگ کو اپنی جنگ سمجھتی ہیں۔ وہ بڑی بہادری اور دلیری سے مشکلات کو جھیلتی ہیں جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کسی کام کی غرض و غایت کو سمجھ کر کرنے اور یونہی کرنے میں کس قدر فرق ہوتا ہے۔ غرض جب تک کسی کام کے فوائد معلوم نہ ہوں۔ جوش پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور پھر جب تک اس کے کرنے کے ذرائع معلوم نہ ہوں۔ کامیابی نہیں ہوسکتی۔ مثلاً کوئی طالب علم ہو اور وہ چاہتا ہو کہ مَیں فاضل ہوجاؤں اور

اعلیٰ اسنادات حاصل کروں۔ مگر اس کو معلوم نہ ہو کہ فاضل ہونے کے لیے کسقدر محنت کی ضرورت ہے اور وہ ایک آدھ گھنٹہ پڑھ کر ہی اس کو کافی سمجھ لے تو کیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیگا۔ ہرگز نہیں کیونکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ فاضل بننے کے ذرائع معلوم کر کے ان پر کاربند ہو اور اس مقصد کے راستہ میں حائل ہونے والے موانعات کا پتہ لگا کر انہیں دور کرے۔ اگر وہ ایسا کریگا تو لازماً کامیاب ہو جائیگا یہی بات ہر ایک مقصد اور دُعا کے لیے ضروری ہے۔

ہماری جماعت میں داخل ہونے والوں کے لیے بھی اس کی طرف توجہ کرنے کی بہت ضرورت ہے انہیں چاہیئے کہ وہ سوچیں کہ اس جماعت میں داخل ہونے کی ہماری غرض کیا ہے اور کیا فوائد ہیں جو ہمیں حاصل ہونگے اور کیا مشکلات ہیں جو ہمارے راستہ میں حائل ہونگی۔ پھر یہ جن اغراض کو لیکر ہم اس جماعت میں آئے ہیں اور جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں۔ ان کو پورا کرنے کے لیے کسقدر سعی اور کوشش کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اگر یہ معلوم نہیں اور اس کے مطابق عمل نہیں تو ان کی کوشش اُدھوری ہوگی۔ ان کے جوش سرد ہونگے۔ ان کی محنت ناتمام ہوگی۔ اور ان کے ولولے ٹھنڈے ہونگے انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کے صرف احمدی کہلانے کی وجہ سے انہیں کامیابی حاصل نہ ہو جائیگی۔ کیونکہ کامیابی نام سے نہیں ہوتی۔ بلکہ کام سے ہوتی ہے اور کام پورے جوش اور محنت سے اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کے فوائد اس کے کرنے کے طریق اور اس کے موانعات کا پورا پورا علم اور آگاہی نہ ہو۔ صرف نام رکھ لینے سے اگر کامیابی ہو سکتی تو پھر خدا تعالیٰ کو ایک نبی کو بھیج کر اس کے بعد کسی دوسرے کے بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ فقط ایک آدم علیہ السلام کی طرف منسوب ہونے والے آدمی کہلاتے رہتے اور آج تک آدمی کہلا رہے ہیں، لیکن چونکہ محض آدمی کہلانا کافی نہیں تھا اس لیے خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے بعد دوسرے نبیوں کو بھیجا۔ کیونکہ آدمی اسماً تو کہلاتے تھے لیکن وہ آدم کی حقیقت ان میں نہیں پائی جاتی تھی۔ جو حضرت آدم میں خدا نے رکھی تھی اور جس کے لیے انہیں مبعوث کیا تھا۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کی اُمت نے حضرت نوحؑ کے کاموں کو جب چھوڑ دیا۔ تو باوجود حضرت نوحؑ کی اُمت کہلانے کے خدا نے ایک اور نبی بھیجا۔ جس نے ان کو اصل حقیقت کی طرف متوجہ کیا۔ پھر اگر محض نام کے لحاظ سے کسی جماعت میں داخل ہو جانا نجات کے لیے کافی ہوتا۔ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے سے نجات ہوتی۔ کیونکہ آدمؑ کی تمام اولاد میں سے آج تک کوئی انسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی شان کا پیدا نہیں ہوا، اور نہ آئندہ پیدا ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو تمام بنی آدم پر ہر لحاظ سے فضیلت اور بڑائی بخشی ہے۔ پس اگر کسی اسمی تعلق کی وجہ سے

نجات ہو سکتی ہے۔ تو یقیناً اس نبیوں کے بادشاہ اور اولیاء کے شہنشاہ کی طرف منسوب ہونے سے ہو جاتی لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسماً منسوب ہونے سے اس وقت تک نجات نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان مقاصد اور اغراض کو نہ پورا کیا جاتے جو آپ کی اُمت میں داخل ہونے سے عائد ہوتے ہیں۔ تو پھر آپ کے خادم حضرت مسیح موعودؑ کی جماعت میں اسماً داخل ہونے سے کب نجات ہو سکتی ہے۔ پس جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کے لیے عمل کی ضرورت تھی۔ قربانیوں کی ضرورت تھی محنت اور تکالیف برداشت کرنے کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے مال و جان۔ اولاد عزت و آبرو۔ غرض ہر ایک پیاری سے پیاری چیز لگا دینے کی ضرورت تھی۔ اسی طرح اس جماعت میں بھی اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے جو ہمارا مقصد ہے تمام چیزوں کو قربان کر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ محض اس میں داخل ہو جانا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

ہماری جماعت میں داخل ہونے والے افراد کا فرضِ اوّلین ہے کہ وہ سوچیں کہ کیوں اس جماعت میں داخل ہوتے ہیں اور جب انہیں اس میں داخل ہونے کا مقصد معلوم ہو جاتے تو پھر دیکھیں کہ اس مقصد کے حصول کے لیے کن کن کوششوں کی ضرورت ہے، اس کے رستہ میں کیا کیا روکیں ہیں۔ ان روکوں کو کس طرح دُور کیا جا سکتا ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہماری جماعت کی غرض اتحاد باللہ یعنی خدا کے ساتھ تعلق پیدا کرنا ہے اور جب کوئی شخص کسی دینی سلسلہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ اس صداقت کو جو اسے حاصل ہوئی ہے۔ دوسرے لوگوں تک پہنچاتے اور اسے پھیلاتے۔ پس ہماری جماعت کی غرض تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے اتحاد ہو۔ اور یہ ایک ایسی غرض ہے کہ اسی میں شفقت علی خلق اللہ اور اسی میں طہارت نفس آجاتی ہے اور اسی میں اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا بھی آجاتا ہے۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک وفد آیا اور عرض کی حضور کوئی ایسی جامع بات بتائی جاتے جس کی وجہ سے ہم جنّت میں داخل ہو جائیں۔ آپ نے ان کے لیے پہلی بات یہ فرمائی کہ الایمان باللہ وحدہ اللہ کو ایک سمجھتے ہوتے اس پر ایمان لاؤ۔ اس پر آپ نے فرمایا: اتدرون ما الایمان باللہ وحدہ کیا جانتے ہو ایک اللہ پر ایمان لانا کیا ہے؟ انہوں نے کہا اللہ اور اس کا رسول ہی جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ و ان محمداً رسول اللہ و اقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ و صیام رمضان۔ کہ یہ شہادت دینا کہ اللہ ایک ہے اور محمدؐ اس کا رسول ہے اور نماز پڑھنا۔ زکوٰۃ دینا اور روزے رکھنا[1]

---

[1] بخاری کتاب الایمان باب اداء الخمس من الایمان

ہم میں اور غیر مبائعین میں جو جھگڑا ہے۔ وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے فیصل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حضرت مسیح موعودؑ کی نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے علیحدہ کوئی نبوت نہیں ہے۔ پس جس طرح خدا کی وحدانیت پر اسی وقت ایمان لایا جاسکتا ہے۔ جبکہ خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا جاتے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ کی رسالت کو اسی وقت مانا جا سکتا ہے جبکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت پر ایمان ہو۔ والّا نہیں۔

تو اسلام کا خلاصہ اللہ تعالٰے سے تعلق ہے۔ باقی نفس کی اصلاح اور شفقت علی خلق اللہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتحاد ہونے میں آجاتی ہیں۔ اس کے لیے جو بھی مشکلات اور روکاوٹیں ہوں انہیں دیکھنا چاہیئے۔ ان کے رفع کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اگر کسی میں طہارتِ نفس اور شفقت علی اللہ نہیں تو اس کا اتحاد باللہ کا دعویٰ غلط ہے۔ خدا کے ساتھ محبت کا تعلق ایک تو خود اپنے نفس سے ہے جو طہارت نفس کہلاتا ہے اور دوسرا اپنے سے غیر کے ساتھ جو شفقت علی خلق اللہ ہے اگر ان دونوں میں سے کوئی نہیں تو اتحاد باللہ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ عبادات۔ امانداری حکومت کے فرائض کی ادائیگی، غرض دنیا کے سب کام اس میں آجائینگے۔ اور یہ اغراض جو ہیں۔ ان سب کے حصول کے لیے بڑی محنت اور کوشش کی ضرورت ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جتنی سعی کی ضرورت ہے۔ اتنی ہی احتیاط کی بھی ضرورت ہے کیونکہ جسقدر کوئی کام اہم ہوتا ہے۔ اسی قدر اس کے لیے احتیاط کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ایک پیسہ کہیں ضائع ہو۔ تو اس کی چنداں پرواہ نہیں کرتا، لیکن جہاں اس کے بیٹے کی جان خطرہ میں ہوگی۔ وہاں نہایت کوشش و احتیاط کو کام میں لائیگا۔ چونکہ یہ کام بھی کوئی معمولی نہیں ہے۔ اس لیے اس کے لیے معمولی احتیاط کی ضرورت نہیں۔ بلکہ غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جتنا عظیم الشان کام ہوتا ہے۔ اتنی ہی بڑی بڑی روکیں اسکے رستہ میں حائل ہوتی ہیں۔ جو مقصد آپ کے مدِنظر ہے وہ چونکہ بہت ہی عظیم الشان ہے اس لیے اس مقصد کے حصول میں بڑی بڑی مشکلات بھی ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ جتنا بلند مینار ہوگا۔ اتنی ہی زیادہ محنت اس پر چڑھنے کے لیے برداشت کرنی پڑیگی۔ پس اس مقصدِ عظیم میں جو روکیں اور مشکلات ہیں۔ ان کا دُور کرنا آپ کے فرائض میں داخل ہے جس مقصد کے لیے آپ کھڑے ہوتے ہیں اس سے بڑا اور بہتر کوئی مقصد نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ یعنی خدائے واحد کو پا لینا اور اس سے اتحاد حاصل کر لینا۔ اس کے لیے جو مشکلات حائل ہوں ان کو دُور کرنے کے لیے بہت توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔ خدا پر ایمان لانے کا دعویٰ تو

عیسائی بھی کرتے ہیں، بلکہ اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ موحد تو ہم ہی ہیں اور مسلمان مشرک ہیں۔ لیکن کیا درحقیقت وہ خدا کو ایک مانتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ تو ہمارا مقصد اس قسم کا ماننا نہیں۔ بلکہ حقیقی طور پر خدا کو پالینا ہے۔

پس ہمارا فرض ہے کہ ان تمام روکوں کو دُور کرنے کی کوشش کریں جو اس مقصد کے حصول میں حائل ہوں۔ مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ کسی شخص کو کچھ مال مل جاتا ہے۔ تو وہ دین کی طرف سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ اگر اولاد ہو جاتی ہے تو دین کی طرف سے سُستی ہونے لگتی ہے۔ بعض لوگوں کو رسم ورواج اور عادات۔ عزت وآبرو وغیرہ کا خیال اس مقصد کے حصول میں روک بن جاتا ہے۔ حالانکہ معمولی مقصد تو معمولی کوشش اور سعی سے حاصل ہو جایا کرتا ہے۔ مگر بڑا مقصد تھوڑی کوشش سے حاصل نہیں ہوتا۔ اگر دس سیڑھیوں کی اونچائی ہو تو دس قدم میں چڑھ جائیگا، لیکن قطب صاحب کے مینار پر دس قدم میں نہیں چڑھا جاسکے گا۔ اس کے لیے جتنا وہ بلند ہے اتنی ہی زیادہ کوشش کی ضرورت ہے۔

خدا اور اس کے دین کے لیے ہر قسم کی قُربانی نہ کرنا اس کی توحید پر ایمان لانا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۔ خوب اچھی طرح جان لو کہ تمہارے مال واولاد کھوٹے کھرے کے پرکھنے کا ذریعہ ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ اولاد اور مال مصیبت ہیں۔ لیکن یہ غلط ہیں۔ فتنہ کے معنے کھوٹے اور کھرے میں امتیاز کرنے کا ذریعہ کے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ جب کسی کے پاس مال ہوگا جبھی معلوم ہوسکے گا کہ یہ خدا کی راہ میں مالی قربانی کرتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح جب کسی کے ہاں اولاد ہوگی، جب ہی معلوم ہوگا کہ اولاد کو خدا کی راہ میں قُربان کرتا ہے یا نہیں، لیکن جس کے پاس مال ہے نہ اولاد۔ اس کے متعلق کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو خُدا کی راہ میں دے سکتا ہے۔ اور اُس کا کھوٹا کھرا کیوں کر پرکھا جاسکتا ہے۔ پس جب ایک مالدار خدا کی راہ میں مال قُربان کریگا تو یہ اس کے لیے ذریعہ تمیز ہو جائیگا اس کے کھرے اور کھوٹے ہونے کا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ مال اور اولاد دینے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ کہ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۔ مال واولاد خدا نے امتحاناً تمہیں بطور نمونہ کے دیئے ہیں۔ اس سے قیاس کر لو کہ جب تم خدا کی راہ میں قُربانیاں کروگے تو وہ خدا جو نمونہ میں ایسی ایسی نعمتیں دے سکتا ہے اور دیتا ہے۔ وہ اجر میں کیا کچھ نہیں دیگا۔ تو فرمایا۔ اللہ کے پاس اجرِ عظیم ہے اب غور کرو کہ وہ خدا جو بغیر کسی عمل کے محض اپنے فضل سے اسقدر مال ودولت دیتا ہے جب کوئی اس کے احکام مانے گا۔ کتنا بڑا اجر دیگا۔ تو مال واولاد خُدا نے نمونہ کے طور پر دیتے ہیں۔ اور اس لیے دیئے ہیں کہ ہم نیکی میں قدم بڑھائیں۔ اور یہ ہمارے لیے نیکی میں بڑھنے کے لیے ترغیب وتحریص

کا موجب ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ لوگ اس نمونہ کی چیز پر ہی اسقدر غافل ہو جاتے ہیں کہ اصل انعام کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ ان کو سوچنا چاہیئے کہ جس خدا کی رحمانیت یہ کچھ کر سکتی ہے۔ اس کی رحیمیت کیا کچھ نہ کرے گی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں جو امراء تھے وہ دین میں سُست نہیں تھے۔ ایک دفعہ غریب اصحاب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضور ہمارے امیر بھائی تو صدقات و خیرات کے ذریعہ بہت سی نیکیاں بجا لاتے ہیں جن سے بوجہ غریبی ہم محروم ہیں۔ اس کے لیے ہمیں کوئی ایسا کام بتا دیجئے کہ جس کے ذریعہ اس کمی کی تلافی ہو سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ۳۳ دفعہ سُبحان اللہ ۳۳ دفعہ الحمدللہ ۳۴ دفعہ اللہ اکبر ہر نماز کے بعد پڑھا کرو۔ جب غرباء نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا تو امراء نے بھی یہ تسبیحیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اس پر غُرباء آنحضرت کے پاس پھر حاضر ہوتے اور کہا کہ حضور امراء نے بھی یہ عمل شروع کر دیا ہے۔ فرمایا۔ اب میں کیا کروں۔ جنکو اللہ نے فضیلت دی ہے میں ان سے کیسے چھین سکتا ہوں[1]۔ یہ حالت سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کے اور کسی نبی کی اُمت میں نظر نہیں آتی۔ حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ کرنے والے ان کی قوم کے سردار ہی تھے اور حضرت مسیحؑ تو دولتمندوں سے اسقدر ستائے گئے معلوم ہوتے ہیں کہ کہتے ہیں۔ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا[2]۔ ایک دفعہ ایک مالدار آپ کے پاس آیا اور عرض کیا مجھکو بھی تعلیم دیجئے۔ آپ نے فرمایا جا پہلے اپنا سب مال تقسیم کر دے اور پھر میرے پاس آ[3]۔ غرض مال تو لوگوں کو نمونہ کے طور پر بغرض آزمائش کے دیا جاتا ہے جس سے نیکی کی طرف ترغیب و تحریص دلانا مدِنظر ہوتا ہے مگر لوگ اسی کو اصل چیز سمجھ کر اس پر ایسے لٹو ہو جاتے ہیں کہ دین کے معاملہ میں بہت سُستی سے کام لیتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں جو اطاعت و فرمانبرداری تھی اسکی نظیر ملنی مشکل ہے۔ انکے امراء بھی غرباء کی طرح دین کے لیے جان نثار اور خادم تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت بڑے مالدار تھے۔ ان کے پاس کئی کروڑ درہم موجود تھا۔ آنحضرتؐ کے ایک دوسرے صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ تھے جنکا عقیدہ تھا کہ انسان کے پاس روز کے خرچ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے اگر ہو تو اس کو اسی روز خرچ کر ڈالنا چاہیئے۔

انہوں نے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ پر اعتراض کیا کہ تم نے اتنا مال کیوں جمع کر رکھا ہے۔ انہوں نے

---

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الذکر بعد الصلوٰۃ ؛ [2]، [3] لوقا $\frac{18}{25}$

جواب دیا کہ بیشک میرے پاس بہت مال ہے، لیکن میری ذات پر مہینہ میں تین چار درہم سے زیادہ خرچ نہیں ہوتے[1]

ہماری جماعت غرباء کی جماعت ہے۔ اس میں نہ بڑے بڑے زمیندار ہیں۔ نہ بڑے بڑے تاجر۔ بلکہ جو لوگ بڑے سمجھے جاتے ہیں۔ وہ چونکہ غرباء میں شامل ہیں۔ اس لیے ان غرباء کی نسبت سے بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ درحقیقت دوسروں کے مقابلہ میں ہماری جماعت کے امراء بھی غرباء ہی ہیں۔ حالی کا شعر ہے ؎

کردیا مرکے یگانوں نے یگانہ ہمکو ورنہ یہاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

کہ وہ شعراء جو بڑے تھے۔ وہ تو مر گئے اس لیے ہم جو بڑے نہ تھے۔ بڑوں کے نہ ہونے کے باعث بڑے شمار ہونے لگے۔ تو ہماری جماعت کے امراء واقعی امراء نہیں بلکہ وہ غرباء کی جماعت میں ہونے کے باعث غرباء کی نسبت سے امیر ہیں۔ اگر اور لوگوں کی نسبت دیکھا جائے تو وہ امراء میں شامل نہیں ہوسکتے۔ ایک کنسٹبل جب زمینداروں میں جائیگا تو داروغہ جی یا جمعدار صاحب کہلائیگا، لیکن جب وہ تھانیدار کے سامنے ہوگا تو اس وہی پوزیشن ہوگی جو اس کے سامنے ان زمینداروں کی تھی۔ پس درحقیقت ہمارے سلسلہ کے امراء کی امارت نسبتی ہے ورنہ بڑے بڑے تاجروں کے مقابلہ میں اگر کوئی تاجر بھی ہے تو اس کی بڑی شان نہیں۔ ایسے ہی اگر کوئی زمیندار ہے تو وہ بھی معمولی ہے۔ یا کوئی چار پانسو روپیہ ماہوار کا نوکر ہے۔ یا کسی کا پیشہ وکالت ہے یا اور کوئی کام کرتا ہے مگر اتنے پر بھی میں دیکھتا ہوں کہ عام طور پر ایسے لوگ دین کے معاملات میں سستی سے کام لیتے ہیں اور انہوں نے اس غرض کو جو اس سلسلہ میں شامل ہونے کی تھی۔ پس پشت ڈال رکھا ہے۔ نمازوں میں سستی کرتے ہیں۔ یا اور کوئی دین کا کام سپرد کیا جاتا ہے تو اس کی نسبت لاپرواہی برتی جاتی ہے۔ کسی انجمن کے ممبر ہوتے ہیں تو اس میں شامل نہیں ہوتے۔ اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کو اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ کیا ایسے لوگوں کو خبر نہیں کہ حضرت مسیح موعودؑ نے ان کے لیے ایک بددعا کی ہے۔ جو دین کی طرف سے لاپروا ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے ؎

اے خدا ہرگز مکن شاد آں دل تاریک را

آنکہ او را فکر دین احمد مختار نیست

کہ اے خدا اس تاریک دل کو کبھی خوش نصیب نہ کر جسکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی فکر نہیں ہے۔ یہ بددعا ہے۔ جو حضرت مسیح موعودؑ کے منہ سے دین سے غفلت برتنے والوں کے حق میں نکلی ہے۔ اسلئے

---

[1] اصابہ جلد ۴ و سیرۃ الصحابہ جلد اول صفحہ ۱۲

ان لوگوں کے لیے نہایت خوف کا مقام ہے۔ جو اسلام کی اشاعت کے لیے کوشش نہیں کرتے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے جسقدر امراء ہمارے سلسلہ میں شامل ہیں۔ وہ سب دین کے لیے خاص جوش اور قربانی کرتے ہیں، لیکن پنجاب کے امراء میں سستی پائی جاتی ہے۔ گو پنجاب کے غرباء دین میں بہت بڑھے ہوئے ہیں مگر امراء بہت پیچھے ہیں، لیکن ہندوستان کے امراء کی حالت پنجاب کے امراء سے دین کے معاملہ میں بالکل مختلف ہے وہ جس طرح مال کے لحاظ سے درجہ کے لحاظ سے پنجاب کے لوگوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح دین کے لیے جوش و اخلاص۔ تواضع و انکسار میں بہت بڑھے ہوتے ہیں۔ اہلِ پنجاب کے ایسے لوگوں کو بہت جلد اس نقص کو دُور کرنا چاہیئے۔ ورنہ اگر وہ دین کے معاملات میں چستی اور جوش و اخلاص اور ایثار و قربانی سے کام نہیں لینگے تو یاد رکھیں کہ وہ خدا جو دے سکتا ہے۔ وہ لے بھی سکتا ہے۔ خدا نے یہ مال وغیرہ ان کو اس لیے دیا تھا کہ ان کی آزمائش کی جاتے اور کھوٹے کو کھرے سے اور جھوٹے کو سچے سے الگ کر کے رکھ دیا جاتے۔ اور یہ نمونہ کے طور پر اس نے انہیں عطا کیا تھا پس اگر وہ اسی پر غافل ہو گئے۔ تو واقعی یہ مال ان کے لیے آفت ہو جائیگا جس کی انکو خبر نہیں۔

ہم میں جو معزز ہیں۔ جو عالم ہیں۔ جو مالدار ہیں یا جو ذی وجاہت و ذی مرتبہ ہیں۔ ان سب کا فرض ہے کہ وہ سستی اور کاہلی کو چھوڑ دیں۔ بڑائی و نخوت سے بالکل پاک ہو جائیں اور نیکی میں ترقی کریں۔ دین کے لیے قربانی کریں اور دین کے کاموں کو ہتک نہ خیال کریں۔ بلکہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو خدا کے فضل ان کے ساتھ ہونگے۔ ورنہ خدا کی گرفت سخت ہے اور حضرت صاحب کی بددُعا ہے کہ خُدایا جو لوگ دین سے بے فکر ہیں انکو خوشی نصیب نہ ہو۔ جس طرح غرباء دین کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اور اعمال شرعی کو بجالانے میں سُست نہیں اسی طرح انہیں بھی دین کی خدمت کرنا چاہیئے۔ بلکہ ان سے بڑھکر کیونکہ ان پر خدا کے زیادہ فضل ہیں، لیکن اگر وہ نہیں کریں گے تو یاد رکھیں کہ وہ خدا جو نعمت دے سکتا ہے۔ وہ واپس بھی لے سکتا ہے۔

خُدا تعالیٰ آپ لوگوں کو دین کی خدمت کرنے کی توفیق بخشے اور سستیوں کو دُور کر کے اپنے راستہ میں وقت اور مال خرچ کرنے کا موقعہ نصیب کرے تا آئندہ اس کے فضل آپ لوگوں سے رُک نہ جائیں بلکہ اور زیادہ بڑھتے رہیں۔"

(الفضل ۷ ستمبر ۱۹۱۸ء)

◎